عالمی امن

ایک انسانی نظریہ

دلائی لامہ

عالمی امن

ایک انسانی نظریہ

عزّت مآب جناب تین زن گیاتشو
چودھویں دلائی لامہ

مترجم
پروفیسر پرمانند شرما

پہلی انگریزی اشاعت ۱۹۸۴ء
وِزڈم پبلی کیشنز
لندن

اُردو ترجمہ ۱۹۸۷ء

اشاعت کردہ :
محکمۂ اطلاعات
مرکزی تبتن سکریٹریٹ
گنگچن کی شوں ۔ دھرم سالہ 176215
ہماچل پردیش ۔ بھارت

مطبوعہ :
اندر پرستھ پریس ، نہرو ہاؤس ، ۴ بہادر شاہ ظفر مارگ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پیش لفظ

"عالمی امن — ایک انسانی نظریہ" عزت مآب دلائی لامہ کی قلم سے نکلی ہوئی ایک ایسی دستاویز ہے جو ایک آسان سلیس اور عام فہم اصولوں پر مبنی عالمی امن کی تحصیل کے لئے راستہ دکھلاتی ہے۔ عزت مآب دلائی لامہ جو خود مہا کرونا کے اوتار بودھی ستو ہیں عالمی امن کے چیدہ چیدہ پرستاروں میں سے ہیں اور دیس ودیس میں باوجود اپنی مصروفیات کے نعرۂ امن بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے۔ اُن کا یقینِ کامل ہے کہ دھرم کو سیاست سے الگ رکھ کر ہی ہم زمانۂ حال کی ناگفتہ بہ حالت کو پہنچے ہیں۔ عالمی انسانی قدروں اور قیمتوں پر مبنی دھارمک نظریہ والے سیاست داں اور رہنما ہی نہ صرف اپنے ملک وقوم بلکہ تمام دنیا کو صحیح راستہ دکھا سکتے ہیں اور پرمانو بم کے خطرے سے سہمی ہوئی انسانیت کو عالمی امن کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔ عزت مآب دلائی لامہ کی موجودگی ہی عالمی امن کے حق میں ایک مضبوط اور پائندہ دلیل ہے۔

"عالمی امن — ایک انسانی نظریہ" کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آج اِس کا اُردو ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہم بہت خوشی اور راحت محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری اُمید ہے کہ تمام اُردو خواندہ لوگ عزت مآب دلائی لامہ کے بلند خیالات سے مستفید ہوں گے۔

ہم شکر گذار ہیں پروفیسر پرمانند شرما کے جنھوں نے اِس ترجمہ میں ہماری مدد کی ہے اور ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ یہ نایاب دستاویز سامعین تک پہنچا سکیں۔

نیاز مند

سونم توپگیال

سکریٹری جنرل

محکمۂ اطلاعات. مرکزی تبتن سکریٹریٹ

دھرم سالہ

مقدمہ

جب ہم صبح اُٹھتے ہیں اور ریڈیو سُنتے ہیں یا اخبار پڑھتے ہیں تو ہمارے روبرو روزانہ وہی خبریں درپیش ہوتی ہیں ۔ تشدّد، جُرم، لڑائیاں اور حادثات ۔ مجھے ایک بھی ایسا دن یاد نہیں پڑتا جس دن کسی نہ کسی جگہ کوئی نہ کوئی المناک واقعہ نہ ہُوا ہو۔ ظاہر ہے کہ اِس زمانۂ جدید میں بھی انسان کی قیمتی زندگی محفوظ نہیں ہے ۔ ماضی میں کسی پیڑھی کو اِس قدر بُری خبروں سے دوچار نہیں ہونا پڑا جس قدر موجودہ پیڑھی کو۔ ڈر اور تناؤ کا یہ لگاتار احساس اتنا شدید ہے کہ ہر حسّاس اور رحمدل انسان موجودہ دنیا کی مبینہ ترقی کے بارے میں بغور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

افسوس اِس بات کا ہے کہ سب سے زیادہ خطرناک مسائل زیادہ تر صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی دین ہیں ۔ سائنس اور تکنیک نے بیشتر شعبوں میں جادوئی کرشمے کئے ہیں مگر بنیادی انسانی مسئلے ویسے کے ویسے ہی ہیں ۔ پڑھائی لکھائی عام ہوگئی ہے مگر اِس تعلیم سے بھی اچھائی کو تقویت نہیں ملی ہے بلکہ اِس کے برخلاف ذہنی بیچینی اور بے اطمینانی بڑھی ہے ۔ بِلاشُبہ مادّی ترقی اور تکنیک کو بہت فروغ ملا ہے مگر یہ سب ناکافی ہے کیوں کہ تا حال ہم امن اور خوشی لانے یا انسانی دُکھ دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ۔

اِس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری ترقی اور ارتقاء میں اہم خامیاں

ہیں اور اگر ہم جلد اُنھیں دُور نہیں کرسکے تو انسانی مستقبل کے لئے تباہ کن خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ میں سائنس اور تکنیک کے بالکل برخلاف نہیں کیوں کہ ان دونوں نے انسان کے مجموعی تجربات ہماری مادّی سہولتوں اور بہبودی اور اپنی اِس دنیا کو اچھی طرح سمجھ لینے میں نمایاں حصّہ ڈالا ہے۔ بہرحال اگر ہم سائنس اور تکنیک کو زیادہ اہمیت دیں گے تو خطرہ یہ ہے کہ ہمارا انسانی علم اور معاشرے کے اُن پہلوؤں سے قطعِ تعلّق ہوجائے گا جو دیانت داری اور علمِ مجازی کے خواہاں ہیں۔

بے شک سائنس اور تکنیک بے پناہ دُنیوی آرام مہیّا کرسکتے ہیں مگر وہ کبھی اُن قدیم روحانی و انسانی قدروں کی جگہ نہیں لے سکتے جنھوں نے مُلکی سطحوں پر اُس عالمی تہذیب کو رُخ دیا ہے جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ سائنس اور تکنیک کے بے مثال دُنیوی فوائد سے کوئی مُنکر نہیں ہوسکتا مگر بنیادی انسانی مسائل بدستور سامنے ہیں۔ اب بھی اگر پہلے سے زیادہ نہیں تو پہلے کی طرح ہی دُکھ، ڈر اور تناؤ ہیں۔ بدیں وجہ یہ بالکل جائز ہے کہ ایک طرف دُنیوی ترقی اور دوسری طرف روحانی انسانی قدروں میں کسی قسم کا تجاوز قائم کیا جائے۔ اس ربط کو وجود میں لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم انسانی قدروں کو بحال کریں۔

مجھے یقین ہے کہ بیشتر لوگ آج دُنیا کے سامنے درپیش اخلاقی بحران کے متعلق میرے افکار سے متفق ہیں اور وہ اُن تمام انسانیت پرست اور مذہب پرست لوگوں سے جو میری طرح سوچتے ہیں، میری اِس اپیل کی تائید کریں گے کہ ہمیں اپنے معاشرے کو اور زیادہ رحمدل، انصاف پسند اور صُلح کن بنانا چاہیئے۔ میں نہ تو ایک بودھ کے ناطے اور نہ ایک تبّتی کے ناطے بول رہا ہوں، نہ ہی میں عالمی امور پر کسی دسترس کی طاقت پر بول رہا ہوں گو مجھے مجبوراً عالمی امور پر اظہارِ خیالات ضرور کرنا پڑتا ہے۔ میں تو ایک اُس انسان کے ناطے بول رہا ہوں جسے اُن انسانی قدروں کو برقرار رکھنے سے

پیار ہے جو نہ صرف مہایان بدھ مت بلکہ دنیا کے سب بڑے مذاہب کی بنیاد ہیں۔ اِس پہلو سے میں اپنے ذاتی نظریے سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ:

(۱) عالمی مسائل کو حل کرنے کے لئے عالمی انسانیت کا احساس اشد ضروری ہے۔

(۲) رحم عالمی امن کا ستون ہے۔

(۳) دُنیا کے سبھی مذاہب اُسی طرح عالمی امن کے خواہاں ہیں جس طرح ہر رنگ کے انسانیت پرست۔

(۴) ہر انسان کی یہ انفرادی ذمّہ داری ہے کہ وہ سب اداروں کو انسانی بہبود کا آلہ بنانے کی کوشش کرے۔
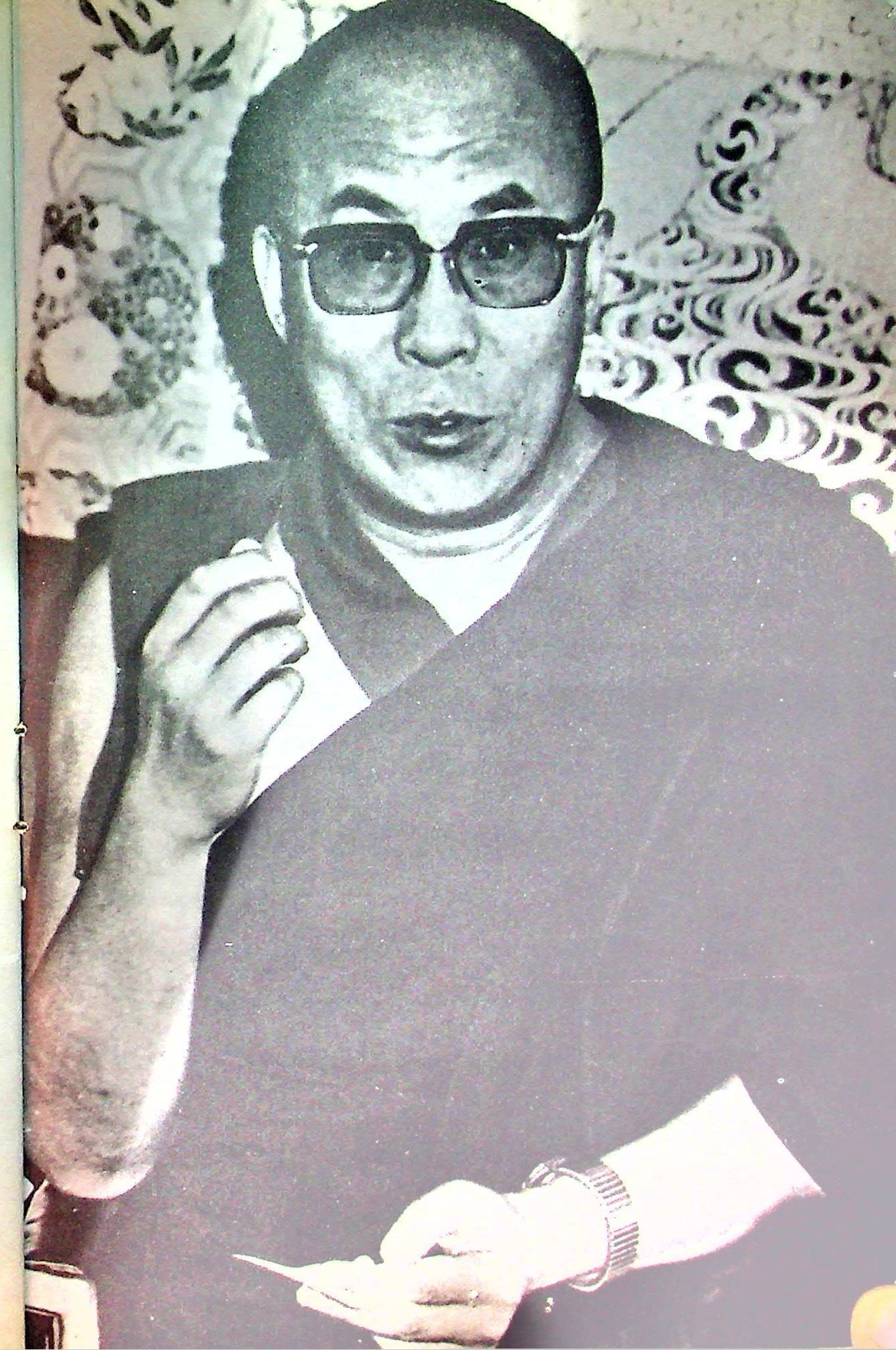
انسانی رویوں میں تبادلے کے ذریعے انسانی مسائل کا حل

آج کل جو مسائل ہمارے سامنے ہیں اُن میں سے کچھ تو قدرتی قہر ہیں جن سے بچا نہیں جاسکتا اور تحمّل مزاجی سے اُن کا مقابلہ کیا جانا چاہیے۔ البتہ دوسرے مسائل غلط فہمیوں پر مبنی ہیں، ہمارے خود کی پیداوار ہیں اور ان کا تدارک ہوسکتا ہے۔ ان میں ایک وہ قسم بھی ہے جس کی جڑ سیاسی یا مذہبی فلسفے ہیں جن کی وجہ سے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے لڑتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ دراصل ہماری بنیادی انسانیت ہی ہمیں ایک انسانی کنبے کے رشتے میں جوڑتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مختلف مذاہب، فلسفے اور سیاسی ڈھانچے صرف انسان کے لیے خوشی فراہم کرنے کے آلات ہیں۔ یہ بنیادی مقصد ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں کبھی طریقوں کو مقصد پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔ مادی اور فلسفانہ مدّعوں کو کبھی انسانیت پر فوقیت نہیں دینی چاہیے۔

انسان ہی نہیں بلکہ ہماری دھرتی کے ہر باشندے کے سامنے آج سب سے بڑا خطرہ ہے ایٹمی تباہی سے۔ اِس خطرے کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں ایٹمی طاقتوں کے اُن سب عالمی سربراہوں سے جن کی مٹھی میں دُنیا کا مستقبل ہے، اور ان سائنس دانوں و تکنیکی ماہروں سے جو یہ بھیانک ہتھیار بناتے ہیں اور اُن سب عوام سے جو کہ اپنے سربراہوں کو موثر کرسکتے ہیں استدعا کروں گا کہ وہ عقل سے کام لیں اور تمام ایٹمی ہتھیاروں کو اُکھاڑنے اور تباہ کردینے کا کام شروع کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایٹمی جنگ

کی صورت میں کوئی فاتح نہیں ہوگا کیونکہ کوئی بھی زندہ نہ بچ پائے گا۔ کیا اِس قسم کی وحشیانہ اور بے رحم بربادی کا تصور بھی خوفناک نہیں؟ اور کیا یہ صحیح نہیں کہ ہم وقت رہتے اپنی تباہی کی اُن وجوہات کو دور کریں جن سے ہم بخوبی واقف ہیں اور جنھیں دور کرنے کی ہم میں سکت ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ہم ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے جن کی وجہ ہمیں معلوم نہیں ہوتی اور اگر معلوم بھی ہو تو قابو پانے کے لیے وسیلے نہیں ہوتے۔ بہر حال ایٹمی خطرے کے بارے میں تو ایسا نہیں ہے۔

ہر جاندار چیز چاہے وہ انسان ہو جو کہ ارتقائی سفر میں بہت آگے ہے یا وہ عام جانور ہو امن، آرام اور تحفظ کا خواستگار ہے۔ بے زبان جانور کو بھی جان اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ ایک انسان کو۔ چھوٹے سے چھوٹا کیڑا بھی جب اس کی جان کو خطرہ ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس طرح ہم میں سے ہر کوئی جینا چاہتا ہے، مرنا نہیں۔ اسی طرح سے دنیا کا ہر جانور گو اس کے پاس بچاؤ کے طریقے محدود ہیں۔

موٹے طور پر سُکھ اور دُکھ دو قسم کے ہوتے ہیں، جسمانی اور ذہنی۔ اِن دونوں میں ذہنی دُکھ اور سُکھ زیادہ شدّت کے ہوتے ہیں۔ اِسی وجہ سے میں ذہنی تربیت پر زور دیتا ہوں تاکہ انسان دُکھ کو بخوبی برداشت کر سکے اور سکھ کو دیرپا بنا سکے۔ تاہم سُکھ کے بارے میں میرا ایک اور نظریہ بھی ہے جو کہ عام مگر زیادہ پختہ ہے یعنی کہ ذہنی سکون اقتصادی ترقی اور عالمی صلح کا ایک کارآمد معجون ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ عالمی ذمہ داری کا وہ جذبہ پیدا کیا جائے جو بِلا لحاظ مذہب و ملّت و رنگ و نسل بنی نوعِ انسان کے حق میں برابر سوچے۔

عالمی ذمہ داری کے اِس خیال کی بنا یہ حقیقت ہے کہ عام طور پر دوسروں کی خواہشات بھی میری خواہشات کی طرح ہی ہیں۔ ہر فرد خوشی کا خواہاں ہے اور دُکھ سے گریز کرتا ہے۔ اگر ہماری انسانی عقل اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتی ہے تو یقیناً اِس

دھرتی کے دُکھوں میں اضافہ ہوگا۔ اگر زندگی میں ہمارا نظریہ تنگدلی کا رہا تو ہم ہمیشہ اپنی مطلب پرستی کے لیے دوسروں کو استعمال کرتے رہیں گے اور عارضی فائدوں کے باوجود عالمی امن تو کیا ہم ذاتی دائمی مسرّت سے بھی قطعی محروم رہیں گے۔

سُکھ کی تلاش میں انسان نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں جو عموماً تشدّد آمیز اور قابلِ نفرت تھے۔ انسانیت کے تقاضوں کے عین متضاد عمل کرتے ہوئے وہ خود انسان اور دیگر جانداروں کو ذاتی مفاد کی خاطر تکلیف پہنچاتا ہے۔ آخرش اِس قسم کی تنگ نظری سے نہ صرف خود کو بلکہ اوروں کو بھی دُکھ دیتا ہے۔

بطور انسان پیدا ہونا ہی ایک نایاب تحفہ ہے۔ اس لیے یہ اشد ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اِس موقعے کا صحیح اور مدبّرانہ ڈھنگ سے استعمال کیا جائے۔ ہمیں عالمی سطح پر احساسِ زندگی کے پہلو سے دیکھنا لازم ہے تاکہ کسی ایک فرد یا مجموعے کی خوشی اور بہبودی دوسروں کی قیمت پر حاصل نہ کی جائے۔

مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لیے امنِ عالم کے حق میں ایک نئے زاویے سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ آج دنیا بہت چھوٹی ہو چکی ہے اور باہم انحصار بھی بڑھ گیا ہے کیونکہ تکنیکی نے بہت ترقی کی ہے۔ عالمی تجارت بڑھی ہے اور مختلف ممالک میں باہمی رابطے کو نمایاں فروغ حاصل ہوا ہے۔ اب ہم بڑی حد تک ایک دوسرے پر منحصر بھی ہو گئے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں مسئلے زیادہ تر کنبوں کی حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے اور اُن کا حل بھی اُسی سطح پر ہو جاتا تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آج کل ہم ایک دوسرے پر اتنے منحصر ہیں، ایک دوسرے سے اتنے منسلک ہیں کہ عالمی ذمہ داری کے نظریے کی بنا اور عالمی بھائی چارے کے اِس خیال کے بغیر کہ ہم سب ایک ہی انسانی کنبے کے فرد ہیں ہم نہ صرف عالمی امن ہی نہیں قائم کر سکتے بلکہ انسان کے وجود کے تئیں لاحق خطرات پر عبور حاصل نہیں کر سکتے۔

اب کوئی بھی قوم اپنے مسائل کو تنِ تنہا ہی حل نہیں کرسکتی کیونکہ موجودہ حالات میں دوسری اقوام کے نظریے، دل چسپی اور تعاون پر بھی بہت کچھ مبنی ہے۔ اس لیے عالمی مسئلوں کے تئیں ایک جامعہ انسانی رویہ ہی عالمی امن کی مضبوط بُنیاد بن سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہمیں اُسی سابقہ یقینِ مذکور سے کہ ہر کوئی خوشی نہ کہ رنج کا خواہش مند ہے شروعات کرنا ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسانی کُنبے کے دوسرے افراد کے احساسات و خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر فقط اپنی ہی مسرّت کے تحصیل کی سعی محض ایک اخلاقی جرم اور دنیوی بے وقوفی بن کر رہ جائے گی۔ اس لیے عقلمندانہ راستہ یہی ہے کہ اپنے سکھ کی تلاش میں ہم دوسروں کو نہ بھُول جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے خود غرضی کو عقل کا پروان چڑھے گا جس سے ہم سانجھے فلاح و بہبود کی سمت گامزن ہوسکیں گے۔

مختلف اقوام کے ایک دوسرے پر انحصار کی وجہ سے زیادہ طور پر باہمی اشتراک پیدا ہونا لازم ہے مگر جب تک لوگ دوسروں کی خوشی اور احساسات سے بہرہ ور نہیں ہوتے، صحیح اشتراکیت کے جذبے کا پیدا ہونا قدرے مشکل ہے۔ طمع اور حسد کے جذبات صلح کُن ماحول پیدا نہیں کرسکتے۔ وہ تمام سیاسی مسائل جو کہ دورِ حاضر کے تنگدلانہ نظریے کی پیداوار ہیں شاید روحانی نظریے سے پوری طرح حل نہ ہوسکیں مگر بالآخر اِس کے تحت اُن تمام بنیادی باتوں پر قابو پایا جاسکے گا جو اِن مسائل کی تہ میں ہیں۔

اِس کے برعکس اگر انسان اپنی الجھنوں کو سُلجھانے کے لیے محض عارضی فائدے کے لیے قدم اٹھاتا رہے گا تو آنے والی نسلوں کی

مشکلات میں اضافہ ہی ہوگا۔ عالمی آبادی بڑھ رہی ہے اور دھرتی کے ذرائع تیز رفتاری سے خرچ ہوتے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر درختوں کو ہی لیجئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بڑے پیمانے پر جنگلات کی کٹائی کے آب و ہوا، زمین کی سطح اور عالمی ماحول پر بحیثیت مجموعی کتنے خوفناک اثرات ہوسکتے ہیں۔ آج ہمیں اسی لیے مسئلے درپیش ہیں کیونکہ لوگ بنی نوع انسان کی فکر نہ کر کے محض مطلب پرستی اور خودغرضی سے کام لے رہے ہیں۔ وہ نہ اِس دھرتی کا سوچتے ہیں اور نہ ہی بین الاقوامی سطح پر ان کے مضر اثرات کو۔ اگر موجودہ پیڑھی اس بارے میں غور نہیں کرے گی تو آنے والی نسلوں کے لیے اِن مشکلات کا مقابلہ کرنا بہت دوبھر ہو جائے گا۔

عالمی امن کا ستون، رحم

بودھ نفسیات کے مطابق ہماری زیادہ تر مشکلات کی وجہ ہیں۔ ہماری خواہشات اور ہمارا جذبہ علایق اُن اشیا کے لیے جنھیں ہم اپنی کم فہمی میں دیرپا مان بیٹھتے ہیں۔ خواہیدہ اور چُنیدہ مقاصد کو حاصل کرنے کے واسطے زور زبردستی اور مقابلہ بازی کے مبینہ کارآمد ہتھیاروں کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اِس قسم کا ذہنی ردِّعمل جب حقیقت میں بدلتا ہے تو اُس کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے باہمی کشاکش اور لڑائی۔ زمانۂ قدیم سے اِس نوعیت کی ذہنیت اِنسانی دل و دماغ کا حصّہ بن کر رہی ہے مگر موجودہ حالات میں ایسے ذہنی خیالات کو پُراثر عملی جامہ پہنانا قدرے آسان کام بن گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہم، طمع اور زور و جبر کے زہر پر قابو پانے

کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں جب کہ دُنیا کی ہر تکلیف کی جڑ یہی منحوس چیزیں ہیں۔

بودھ دھرم کی مہایانی روایتوں میں تربیت یافتہ ہونے کے کارن میرا یقین ہے کہ رحم و محبت عالمی امن کے اخلاقی ڈھانچے کا حصّہ ہیں۔ رحمت سے میری کیا مُراد ہے؟ جب آپ کسی نہایت غریب شخص کے واسطے رحم و کرم کا احساس کرتے ہیں تو آپ اُس کی غریبی کی وجہ سے اس کے ساتھ ہمدردی دکھاتے ہیں۔ آپ کے اِس جذبے کی بنیاد ہے روحانی قدریں۔ برعکس اِس کے بیوی، خاوند، بچّوں یا نزدیکی دوست کے لیے پیار عموماً علائقت یا لگاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لگاؤ بدلنے پر مہر و کرم بھی بدل جاتے ہیں یا بالکل معدوم ہو جاتے ہیں۔ ایسے پیار کو سچّا پیار نہیں کہہ سکتے کیونکہ صحیح محبّت کی بنیاد روحانیت پر ہوتی ہے نہ کہ لگاؤ پر۔ اگر پیار روحانی ہوگا تو آپ کا جذبۂ رحم تب تک ایک جائز انسانیت سے پُر جذبے کے طور پر قائم رہے گا جب تک دُنیا میں دُکھ کا وجود رہے گا۔

ہمیں خود میں اِسی قسم کا جذبۂ رحم پیدا کرنا چاہیے اور اُسے ایک محدود دائرے سے لامحدود حدوں تک لے جانا چاہیے۔ ہر جاندار شے کے لیے بے امتیاز، فی البدیہہ اور لامحدود جذبۂ رحمت اُس عام پیار سے مختلف ہے جو ہم دوستوں یا اپنے کُنبے کے افراد کے لیے رکھتے ہیں کیونکہ اس آخر الذکر پیار میں تو صرف لاعلمیت، خواہشات اور لگاؤ کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ ہمیں تو اُس پیار کو تقویت دینی ہے جو زیادہ وسیع دائرہ ہے تاکہ ہم اس شخص سے بھی کہ جس نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے یا صریحاً ہمارا دشمن ہے، پیار کر سکیں۔

جذبۂ رحم کی دلیل کا پس منظر یہ ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی دُکھ سے بچنا

اور سکھ کو پانا چاہتا ہے۔ اِس کی بنیاد ہے 'میں' کا جذبہ جس میں ہر ایک کی اپنی خوشی کی تمنّا نہاں ہے۔ دراصل سب لوگ ایک سی خواہشات لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لیے انھیں اِن کو پورا کرنے کا حق بھی یکساں ہونا چاہیے۔ اگر میں اوروں سے اپنا توازن کروں تو اُن لاتعداد افراد کے مقابلے میں مَیں ایک ہوں۔ بدیں وجہ اِن کی اہمیت نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ تبّت کے بودھ دھرم کی روایت کے مطابق انسان کو ہر جاندار کو اپنی ماں تصوّر کرنا چاہیے۔ اور اِس لحاظ سے ان کے تئیں اپنی محبّت کے ذریعے شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہیے۔ بدُھ دھرم کے بموجب ہم لاتعداد دفعہ جنم لیتے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ ہر فرد کسی نہ کسی جنم میں ہمارے والدین میں سے رہا ہو۔ اس طرح دنیا کے سب باشندے ایک قسم کے خاندانیت کے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ چاہے کسی کا مذہب پہ اعتقاد ہو یا نہ ہو مگر کوئی بھی فرد ایسا نہیں جو پیار اور کرم کا دلدادہ نہ ہو۔ وقتِ پیدائش سے ہی ہم اپنے ماں باپ کے مہر و محبت کے سایے تلے ہوتے ہیں۔ عمر کے آخری ایّام میں بیماری اور پیری سے دوچار ہوتے ہوئے ہم پھر دوسروں کے مہر و کرم کے محتاج رہتے ہیں۔ اس طرح اگر زندگی کے شروع اور آخر میں ہم دوسروں کی مہربانی کے زیر بار مرہونِ منّت رہتے ہیں تو کیوں نہ زندگی کے درمیانی ایام میں ہم دوسروں کے ساتھ مہر و محبّت سے پیش آئیں۔

بنی نوعِ انسان سے ہم آہنگی کا جذبہ یعنی دل میں ہمدردی پالنا۔ اس کے واسطے مذہبی رسومات سے وابستہ وہ سب ڈھکوسلے ضروری نہیں ہیں جنھیں ہم عموماً مذہب کا نام دیتے ہیں۔ یہ نہ صرف مذہب پرست لوگوں

کے لیے ہے بلکہ کل لوگوں کے واسطے بلا لحاظِ مذہب و ملّت و سیاسیات واجب عمل ہے۔ یہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو خود کو انسانی برادری کا ایک حصّہ سمجھتا ہے اور جس کا زاویۂ زندگی وسیع اور کشادہ ہے۔ ہمیں اس پُرزور جذبے کو پیدا کرنا چاہیے اور اِسے عمل میں لانا چاہیے۔ برعکس اس کے ہم اِس معاملے میں بالکل لاپرواہی سے کام لیتے ہیں بالخصوص اپنی جوان سالی کے دِنوں میں جب کہ ہم ہر لحاظ سے اپنے آپ کو مبینہ طور پر محفوظ سمجھتے ہیں۔

جب دُور رساں طور سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہر انسان خوشی چاہتا ہے، دُکھ سے بچنا چاہتا ہے۔ دوسرے لاتعداد لوگوں کے مقابلے میں خود کو اکیلا ایک مان کر ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم دوسروں کے ساتھ بانٹ کر اپنے ساز و سامان کو استعمال کریں۔ جب آپ اپنے آپ کو اس قسم کے جذبے میں ڈھال سکیں گے تو رحم و کرم کا اور دوسروں کے واسطے پیار اور عزّت کا صحیح جذبہ پیدا ہونا لازم ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ پیار و خدمت کے جذبے کی ایک قدرتی اور جائز پیداوار ہوگی۔

روزمرّہ زندگی میں روحانی عمل پیرائی کا ایک نتیجۂ خصوصی یہ ہوتا ہے کہ انسان میں ایک اندرونی توازن اور خاموشی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری زندگی میں لمحہ بہ لمحہ اُتار چڑھاؤ رونما ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مشکلات درپیش آتی ہیں۔ ٹھہرے ہوئے اور صاف دل سے مقابلہ کرنے پر سب اُلجھنیں صحیح طریقے سے حل ہو سکتی ہیں۔ برخلاف اِس کے جب نفرت خود غرضی اور غصّے کے تحت ہم اپنے من پر قابو نہیں رکھ پاتے تو ہماری

سوچنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ دل و دماغ پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اُن وحشیانہ لمحوں میں ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں جنگ بھی۔ اِسی وجہ سے رحم و ذہانت پیدا کرنے کی مشق آرائی ہر انسان کے واسطے کار آمد ہے بالخصوص ان کے واسطے جو قوموں کی رہنمائی کرنے والے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں عالمی امن کی عمارت کو تعمیر کرنے کے وسائل و مواقع موجود ہیں۔

تمام مذاہب عالمی امن کے پرستار

اب تک میں نے جن اصولوں پر غور کیا ہے وہ سب دنیا کے تمام مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب جیسے کہ بُدھ مت، عیسائیت، کنفیوشس کا مت، ہندو دھرم، اسلام، جین مت، یہودیت، سکھ مت، تاؤ کا مت، زرتشت دوم، ایک جیسے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اُن سب کی منزلِ مقصود ہے محبّت۔ اور ان کا مقصد روحانی عمل کے ذریعے بنی نوعِ انسان کی بہبودی۔ نتیجے کے طور پر ہر مذہب اپنے پیرو کاروں کو اچھے اور بہتر انسان بنانے کا کوشاں ہے۔ ذہن، جسم اور زبان کی حرکات کو شائستہ بنانے کی خاطر سب مذہب اخلاقی اصولوں کی تربیت دیتے ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ مت بولو۔ چوری مت کرو۔ دوسروں کی جان مت لو۔ دنیا کے عظیم اخلاقی رہنماؤں نے بے لوث محبّت و خدمت کو ہی ساری اخلاقی تعلیم کا عین مقصد قرار دیا ہے۔ یہ عظیم ہستیاں چاہتی تھیں کہ اُن کے تمام پیرو کار بے سود کاموں کے راستے سے جن کی وجہ صرف جہالت ہے سے ہٹ کر اچھائی کی طرف گامزن ہوں۔

سب مذاہب بے لگام ذہن کو لگام دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کیونکہ خودغرضی اور دیگر فسادات کی جڑیں ذہن میں قیام پذیر رہتی ہیں۔ ہر مذہب اُسی راہ کی تلقین کرتا ہے جو اُس روحانی منزل کی سمت لے جاتی ہے جس میں صلح و امن، ضابطہ، اخلاق اور ذہانت ہیں۔ اسی مطلب کو پیش پیش رکھ کر میں یہ مانتا ہوں کہ سب مذاہب یکساں پیغام دیتے ہیں۔ اصولی تفرقے محض وقت اور حالات کی دین ہیں اور ثقافتی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ دراصل اگر ہم مذہب کے خالی پہلوؤں کو ہی دیکھیں تو مدبر دلائل کی کوئی کمی نہیں۔ بہر حال زندگی میں ضروری یہ ہے کہ ہم اُن مشترکہ تعلیمات پر عمل پیرا ہوں جو سب مذاہب کی نظر میں سودمند ہیں بجائے اس کے کہ نکتۂ نظر کے چھوٹے چھوٹے تفرقات کو خاطر میں لائیں۔

جیسے مختلف امراض کے لیے الگ الگ دوائیاں ہیں، اسی طرح انسانی سُکھ شانتی کے لیے الگ الگ کئی مذہب ہیں کیونکہ سب مذہب اپنے اپنے ڈھنگ سے انسان کو سُکھ دینے اور دُکھ سے بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مذہبی حقیقتوں کے ترجمان کہنیں خصوصی پہلوؤں کے ہم زیادہ قائل ہوں۔ بہر حال انسانی دل کی تہہ سے نکلے اتحاد کے پہلو اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر مذہب اپنے طریقۂ خاص سے انسانی تکلیفات کو دُور کرنے اور عالمی تہذیب میں اپنا اپنا حصّہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ تبلیغ میں کوئی تک نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میں نے کبھی دوسروں کو بدھ مذہب میں تبدیل کرنے کی یا بدھ دھرم کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ میں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ ایک انسانیت پرست بودھ ہونے

کے ناطے میں انسانی خوشیوں میں کتنا اضافہ کرسکتا ہوں۔

عالمی مذاہب میں یکسانیت سے میرا مطلب قطعی کسی خاص ایک مذہب کو دوسروں پر ترجیح دینے کا نہیں ہے۔ نہ ہی میرا منشا کسی خاص عالمی مذہب سے ہے۔ انسانی تجربات اور عالمی تہذیب کو خوشحال بنانے کے واسطے مختلف مذہب ضروری ہیں۔ انسانی دل ودماغ الگ الگ نوعیت اور درجے کے واقع ہیں۔ اِس لیے صلح وسُکھ کی تحصیل کے لیے الگ الگ نظریے بھی ضروری ہیں۔ خوراک کو ہی لیجیے۔ کچھ لوگوں کو عیسائیت زیادہ دل آمیز لگتی ہے۔ دوسرے بودھ مت کو اِس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ اِس میں کسی غیبی موجد کا ذکر نہیں بلکہ سارا دار ومدار کیے ہوئے عمل پر ہے۔ اِسی طرح ہم دوسرے مذاہب کے حق میں بھی کوئی نہ کوئی دلیل دے سکتے ہیں۔ اِس لیے صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے الگ الگ طریقوں، مختلف روحانی ضروریات اور فرداً فرداً ہر شخص کو وراثت میں ملی قومی روایات کے مطابق انسانیت کے واسطے ہر مذہب کی ضرورت ہے۔

اِسی نکتۂ خیال سے مذاہب میں باہمی مفاہمت و رواداری کے حق میں دنیا کے کئی خطّوں میں کی جا رہی کوششوں کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ آج کے حالات میں اِس کی اشد ضرورت بھی ہے۔ اگر دنیا کے تمام مذاہب بنی نوعِ انسان کی بہبودی کو اپنا مقصدِ خصوصی بنالیں تو وہ عالمی امن کے لیے یکمشت ہوکر کام کرسکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مذہبی نظریے کو سمجھنے سے وہ اتحاد پیدا ہوگا جس کے ذریعے تمام مذاہب مل جل کر کام کرسکتے ہیں۔ گو یہ ایک ضروری قدم ہوگا تاہم سب مسئلوں کا کوئی فوری یا آسان حل ممکن نہیں۔ مختلف مذاہب میں جو اصولی تفرقات ہیں انھیں

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ہم موجودہ مذاہب کی جگہ کوئی نیا عالمی مذہب کھڑا کر سکتے ہیں۔ ہر ایک مذہب کو اپنا اپنا خصوصی حصّہ ڈالنا ہے کیونکہ الگ الگ قسم کے لوگوں کے لیے ان کے اپنے یقین کے مطابق وہ صحیح ہے اِس دنیا کو بھی ان سب کی ضرورت ہے۔

عالمی امن سے وابستہ مذہبی عمل پیراؤں کے سامنے دو بنیادی کام ہیں۔ اوّل یہ کہ ہمیں الگ مذہبوں میں باہمی رابطے کو فروغ دینا چاہیے تاکہ سب میں ایک کامگار اتحاد پیدا ہو سکے۔ ایک دوسرے کے یقین کے تئیں عزّت کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے اور سب مذہبوں کی انسانی فلاح و بہبود کے لیے فکر کی تائید کرتے ہوئے ہم مجوزہ اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ان بنیادی روحانی قدروں کے بارے میں جو ہر انسانی دل کو چھوتی ہیں اور بحیثیت مجموعی انسانی مسرّت کو فروغ دیتی ہیں ہم آہنگی پیدا کر کے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہمیں انسانیت کے مشترکہ اصولوں کو جو کہ ہر مذہب کا سانجھا ورثہ ہیں، کو تقویت دینی چاہیے۔ ان دونوں اقدام سے ہم فرداً فرداً اور مجموعی طور پر بھی امن عالم کے حق میں ضروری ماحول پیدا کر سکیں گے۔

ہم جو کہ مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں عالمی امن کے لیے مل جل کر کام کر سکتے ہیں اگر ہم ان مذاہب کو محض دل و دماغ کو بہتر بنانے کا ایک آلہ تصوّر کریں جس سے دوسروں کے واسطے محبت اور عزّت اور انسانی ہم آہنگی کا جذبہ پیدا ہو۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم مذہب کے صحیح مقصد کو سمجھیں نہ کہ مذہبیت کی دیگر تفصیلات کو خاطر میں لائیں۔ یہ آخرالذکر تو صرف دماغی ورزش ہے۔ اگر ہم ان

گہرے اصولی مذہبی تفرقات کو بالائے طاق رکھ سکیں جو کہ ہر مذہب کا اندرونی معاملہ ہے تو میرے خیال میں دنیا کے تمام عظیم مذاہب عالمی امن کے لیے اپنا تعاون دے سکتے ہیں اور بنی نوعِ انسان کی بہبودی کے لیے کام کر سکتے ہیں۔

عالمی سطح پر جدیدیت کی وجہ سے بڑھ رہے سیکولرزم کے جذبے اور دنیا کے کئی حصّوں میں منظم طریقے سے مذہبی قدروں کو کالعدم کرنے کی کوششوں کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی اکثریت اب بھی کسی نہ کسی مذہب پر یقین رکھتی ہے۔ مذہب میں یقین کا یہ لافانی جذبہ خصوصاً دین و مذہب سے مبرّا سیاسی نظام والے ملکوں میں مذہب کی قوت کا ایک زندہ ثبوت ہی تو ہے۔ عالمی امن کے حق میں روحانی ماحول پیدا کرنے کے لیے یہ روحانی قوت کارآمد ڈھنگ سے استعمال میں لائی جا سکتی ہے۔ دنیا بھر کے مذہبی رہنماؤں اور انسانیت پرست لوگوں کو اس کام میں ایک کردارِ خصوصی ادا کرنا ہے۔

ہم عالمی امن قائم کر سکیں یا نہ کر سکیں مگر ہمارے سامنے اِس نصب العین کی طرف بڑھنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ اگر غیظ و غصّہ ہمارے دلوں پر حکمراں رہے گا تو ہم عقل جو کہ انسانی ذہانت کا ضروری ترین حصّہ ہے اور جس کے ذریعے ہم بھلے بُرے میں شناخت کر سکتے ہیں، کھو بیٹھیں گے۔ آج دنیا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہے غصّہ۔

اداروں کو بنانے میں انفرادی تعاون کی قوت

زمانۂ حال کے بیشتر تنازعوں کی بڑی وجہ غیظ و غصّہ ہیں۔ مثال کے طور پر مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، شمال و جنوب کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ باہمی جذبۂ انسانیت کو فروگذاشت کرنے کی وجہ سے یہ سب جھگڑے رونما ہوئے ہیں۔ نہ ہی اعلیٰ فوجی طاقت کا استعمال اور نہ ہی ہتھیاروں کی دوڑ اِن کا صحیح علاج ہیں۔ نہ ہی یہ مسئلہ خالص تکنیکی ہے اور نہ ہی خالص سیاسی۔ بنیادی طور پر یہ روحانی مسئلہ ہے کیونکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حالات باہمی کی نزاکت کو ہمدردانہ طور پر سمجھ سکیں۔ نفرت اور لڑائیاں کسی کو خوشی عطا نہیں کر سکتے۔ لڑائی جیتنے والوں کو بھی نہیں۔ تشدّد ہمیشہ مصیبتوں کی جڑ ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے اس کے نتائج منفی ہوتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ عالمی سربراہِ قوم، تہذیب اور اصولوں کے جذبات سے اوپر اُٹھنے کا سبق سیکھیں اور ایک دوسرے کو باہمی ہم آہنگی کی نگہ سے دیکھیں۔ ایسا کرنے سے ہر فرد، ہر قوم ہر مُلک اور تمام عالم کا بھلا ہوگا۔

موجودہ دُنیا میں زیادہ تر تناؤ کی وجہ ہے مشرقی گُٹ اور مغربی گُٹ کے مابین جھگڑا جو کہ دوسری عالم گیر جنگ کے وقت سے ہی ہے۔ یہ دونوں گُٹ ایک دوسرے کے واسطے سراسر نفرت آمیز اور گھٹیا نکتۂ نظر رکھتے ہیں۔ اِس لگاتار تنازعے کی وجہ ہے باہمی رواداری و مروّت کی کمی جو کہ انسان میں ہونی چاہیے۔

مشرقی گُٹ والوں کو مغربی گُٹ والوں کے تئیں اپنی نفرت کو کم کرنا چاہیے کیونکہ مغربی گُٹ بھی مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل ایک انسانی مجموعہ ہے۔ اسی طرح مغربی گٹ والوں کو بھی مشرقی گٹ سے نفرت کو کم کرنا چاہیے کیونکہ مشرقی گٹ بھی انسانوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس کام میں دونوں فریقین کے سربراہوں کو بہت اہم رول ادا کرنا ہے۔ مگر سب سے اوّل ان رہنماؤں کو خود ایک دوسرے کی انسانیت کی قدر کرنا اشد ضروری ہے۔ اس بنیادی احساس کے بغیر منظم نفرت کو کم کرنا بہت دشوار ہے۔

مثال کے طور پر اگر امریکی سربراہ اور روسی سربراہ کی آناًفاناً کسی ویران جزیرے پر ایک دوسرے سے ملاقات ہوجائے تو یقیناً وہ باہم انسان انسان کی طرح پیش آئیں گے مگر جب وہ امریکی صدر اور روسی کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے ایک دوسرے کے روبرو آتے ہیں تو فوراً دونوں کے درمیان باہم غلط فہمیوں اور شکوک کی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے۔ انسانی سطح پر غیر موضوعی اور غیر رسمی طویل ملاقاتوں کے ذریعے آپسی سمجھ بوجھ کو تقویت مل سکتی ہے۔ ایک دوسرے کو انسانی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہوئے باہمی میل جول کی بنیاد پر وہ عالمی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ آپسی نفرت اور شک کے ماحول میں ایسے دو گُٹ جن کے جھگڑے کی لمبی تاریخ ہے، کبھی ایک دوسرے کے ساتھ کارآمد طریقے سے صلح کن بات چیت نہیں کرسکتیں۔

میں تو یہ رائے دوں گا کہ ایک دوسرے کو بحیثیت انسان کے

اچھی طرح سمجھ لینے کے لیے یہ رہنما سال میں ایک دفعہ بغیر رسمی کام کاج کے کسی خوب صورت مقام پر مل کر بیٹھیں۔ بعد ازاں وہ باہمی و عالمی مسائل پر غور کرنے کے لیے بھی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے دوسرے لوگ بھی میرے ہم خیال ہیں کہ عالمی سربراہ اِس قسم کے باہمی بھائی چارے کے جذبے کے تحت بیٹھ کر گفتگو کریں۔

دنیا بھر کے لوگوں میں فرداً فرداً تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے میں عالمی سیر و سیاحت کو فروغ دینے کے حق میں ہوں۔ علاوہ ازیں رسل و رسائل کے عوامی ذرائع بالخصوص جمہوری ملکوں میں اُن انسانی پہلوؤں کو جو کہ بنیادی ہم آہنگی کے ترجمان ہیں، کو زیادہ نشر کر کے عالمی امن کو بڑھاوا دے سکتے ہیں۔ عالمی سطح پر کچھ ایک بڑی طاقتوں کے وجود میں آنے سے عالمی اداروں کے انسانیت نواز رول کو درگزر کیا جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس میں اصلاح ہوگی اور تمام عالمی ادارے خصوصاً یونائیٹڈ نیشنز یعنی متحدہ اقوام کا ادارہ بنی نوعِ انسان کی بیشتر بہبودی اور عالمی بھائی چارے کے حق میں زیادہ تندہی اور پُر اثر طریقے سے کام کریں گے۔ اگر کچھ ایک یورپین ممبران محض خود غرض مقاصد کے لیے اس کا استعمال کرتے رہے تو اس سے بڑی ٹریجڈی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اس عالمی ادارے کی ہر ایک کو توقیر کرنی چاہیے کیونکہ اقوامِ متحدہ ہی چھوٹی چھوٹی مظلوم قوموں بلکہ ساری دھرتی کے واسطے امیدِ واحد ہے۔

چونکہ آج پہلے سے کہیں زیادہ سب اقوام اقتصادی طور پر ایک دوسرے پر منحصر ہیں انسانی میل جول کا دائرہ قومی حدود سے بالاتر تمام انسانی قوم سے منسلک ہونا چاہیے۔ دراصل جب تک ہم پُر معنی تعاون کا ماحول پیدا نہیں کر سکتے جو کہ دلی سمجھ داری نہ کہ طاقت کے استعمال کی دھمکیوں کی پیداوار ہو عالمی مسائل میں اضافہ ہی اضافہ ہوگا۔ اگر غریب ممالک کے باشندوں کو وہ خوشی مہیّا نہیں ہو سکتی جس کے وہ خواہاں ہیں تو وہ بالضرور بدظن رہیں گے اور امیر ممالک کے لیے مسائل پیدا کریں گے۔ اگر لوگوں پر بنا ان کی رضا مندی کے اَن چاہے سماجی، سیاسی اور ثقافتی نظام تھوپے جاتے رہیں گے تو عالمی امن کا قائم ہونا ناممکن ہے۔ البتّہ اگر دل سے دل کی سطح پر ہم لوگوں کی تسلّی کرا سکتے ہیں تو بالضرور امن قائم ہو سکے گا۔ ایک قوم میں ہر فرد کو خوش رہنے کا حق حاصل ہونا چاہیے اور قوموں قوموں میں چھوٹی سے چھوٹی قوم کی فلاح بہبود کا یکساں خیال رکھا جانا چاہیے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی خصوصی طریقۂ حکومت کسی دوسرے طریقۂ حکومت سے بہتر ہے۔ برعکس اِس کے مختلف سیاسی نظاموں اور اصولوں کا ہونا بھی ضروری امر ہے کیونکہ ان کا وجود انسانی فطرتوں کے اختلاف کا آئینہ دار ہے۔ یہ اختلاف ہی ہے جو انسان کو خوشی کی تجسس میں سعئ پیہم پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے ہر قوم کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے لیے خود مختاری کے اصول پر مبنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو ترتیب دے۔

انصاف، رواداری اور امن کا دار و مدار کئی باتوں پر منحصر ہے۔ ہمیں اِن پر دُور رساں انسانی مفاد کے زاویے سے غور کرنا چاہیے نہ کہ عارضی فوائد کے واسطے۔ مجھے احساس ہے کہ ہمارے رو برو کام بہت دشوار ہے مگر مجھے اِس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نظر نہیں آتا جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں کیونکہ اس کی بنیاد ہماری سانجھی انسانیت ہے۔ اس کے سوا اور راستہ ہی نہیں کہ قومیں ایک دوسرے کے بارے میں سوچیں نہ صرف انسانیت میں یقین کی وجہ سے بلکہ اِس لیے کہ سب کا دور رساں فائدہ اِسی میں ہے۔ اس نئے امر کے احساس کا ایک ثبوت ہے علاقائی اور برِّ اعظمی سطح پر اداروں کا وجود میں آنا جیسے کہ یورو پین اکونومک کمیونٹی، شمال مشرقی ایشیائی اقوام کی تنظیم وغیرہ وغیرہ۔ مجھے امید ہے اس قسم کے اور بین الاقوامی ادارے بھی بنائے جائیں گے خصوصاً ان علاقوں میں جہاں اقتصادی ترقی اور علاقائی سلامتی کی کمی ہے۔ موجودہ حالات میں انسانی مفاہمت اور بین الاقوامی ذمے داری کے جذبے کی اشد ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے دل نیکی اور کرم سے بھرپور ہوں کیونکہ اس کے بنا نہ خوشی نصیب ہو سکتی ہے نہ دائمی امن۔ محض کاغذ کے ٹکڑوں پر امن ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ عالمی ذمے داری اور عالمی بھائی چارے کی تلقین کی وجہ یہ کہ آج دنیا الگ الگ حصّوں اور سماجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس لیے دراصل یہی

سماجی عضو ہی متّحد ہو کر عالمی امن کا محل تیار کر سکتے ہیں۔ ایسا میرا خیال ہے۔

ماضی میں بھی انصاف اور یکسانیت پر مبنی سماج کی تعمیر کے لیے کوششیں ہوئی ہیں۔ غیر سماجی عناصر کا مقابلہ کرنے کے لیے عمدہ اصولوں پر مبنی ادارے قائم ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسے خیالات کو دھوکا دیا ہے ہماری خود غرضی نے۔ پہلے سے زیادہ آج ہم دیکھتے ہیں کس طرح اخلاقیات اور اخلاقی قواعد کو بالخصوص سیاسی معاملات میں خود غرضی کے سایے نے ڈھک لیا ہے۔ کچھ لوگ اِس خیال کے بھی ہیں جو سیاست سے بالکل کنارہ کشی کی بھی تنبیہ کرتے ہیں کیونکہ سیاست اور بد اخلاقی نعم البدل الفاظ بن چکے ہیں۔ اخلاق کے بغیر سیاست کبھی انسان کا بھلا نہیں کر سکتی اور اخلاق کے بغیر انسان محض حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ بہر حال سیاست اپنے آپ میں پراگندہ نہیں ہے بلکہ ہماری سیاسیات کے آلات نے ان عظیم مدعوں اور اصولوں کی جن کا مقصد انسانی فلاح بہبود ہے، صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی رہنما مذہبی سربراہوں کے سیاست میں دخل کو ایک اندیشہ سمجھتے ہیں کیونکہ انھیں ڈر ہے کہ ایسا کرنے سے مذہب بھی سیاست کی غلاظت سے پراگندہ ہو جائے گا۔

میں اِس یقینِ عام سے متفق نہیں کہ مذہب اور اخلاقیات کی سیاست میں کوئی جگہ نہیں اور کہ مذہب پرست لوگوں کو فقیروں کی طرح اس سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہنا چاہیے۔ مذہب کے

بارے میں اس قسم کا نکتۂ نظر بالکل یک طرفہ ہے کیونکہ اس میں بشر کے سماج کے ساتھ تعلقات اور زندگی میں مذہب کی اداکاری کے متعلق صحیح پہچان کی کمی ہے۔ اخلاقیات میں کسی بھی سیاست داں کے لیے اتنی ہی ضروری شے ہے جتنی کہ ایک مذہب پرست انسان کے لیے۔ اگر سیاست داں اور حکمراں اخلاقی اصولوں کو درگذر کریں گے تو نتائج بہت سنگین ہوں گے چاہے ہم خدا میں یقین رکھیں چاہے مسئلہ کرم میں، اخلاقیات ہی ہر مذہب کی بنیاد ہے۔

اخلاق، رحمت، بھل مناہت، عقل مندی وغیرہ وغیرہ سب تہذیبوں کی بنیاد رہی ہیں۔ روادار سماجی ماحول میں بتدریج اخلاقی تعلیم کے ذریعے ان اوصاف کی پرورش اور پوشش کی جانی چاہیے۔ اس قسم کی دنیا کی تعمیر کے لیے ضروری خوبیوں کا آغاز بچپن سے ہی بچّوں کی تربیت سے ہونا چاہیے۔ یہ تبدیلی لانے کے واسطے ہم اگلی پشت کا انتظار نہیں کر سکتے بلکہ موجودہ پیڑھی کو ہی بنیادی اخلاقی قدروں کی از سرِ نو شروعات کرنی چاہیے۔ اگر کوئی امید واثق ہے تو وہ آنے والی پشتوں سے ہے مگر ہمیں عالمی سطح پر اپنے تعلیمی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ عالمی انسانی قدروں کے تئیں اپنی ذمے داری کے احساس اور اپنے کردار میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے۔

اخلاقی گراوٹ کو روکنے کی خاطر بلند نعرے بازی کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ ہمیں واقعی کچھ کر دکھانا ہوگا۔ کیونکہ موجودہ

سرکاریں اس قسم کی 'مذہبی' ذمے داری نہیں لیتیں۔ یہ فرض انسانیت نواز اور مذہب نواز افراد پر عائد ہوتا ہے کہ وہ موجودہ شہری، سماجی ثقافتی، تدریسی اور مذہبی اداروں کو مضبوط بنائیں تاکہ انسانی اور روحانی قدریں پھر پنپ سکیں۔ اگر ضرورت پڑے تو ان مقاصد کے حصول کے لیے نئے ادارے بھی وجود میں لائے جانے چاہئیں۔ ایسا کر کے ہی ہم عالمی امن کی خاطر ایک مضبوط بنیاد قائم کر پانے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔

سماج میں رہتے ہوئے ہمیں دیگر شہریوں کے دُکھ کو بانٹنا چاہیے۔ اور نہ صرف اپنے عزیزوں بلکہ دُشمنوں سے بھی رحم اور رواداری سے پیش آنا چاہیے۔ ہماری اخلاقی قوّت کی یہی کسوٹی ہوگی۔

ہمیں خود اپنے کردار سے مثال قائم کرنی چاہیے۔ کیونکہ محض لفظوں سے دوسروں کو مذہب کی اہمیت کے بارے میں یقین نہیں دلایا جاسکتا۔ ہمیں خود دیانت داری اور قربانی کے اُن عظیم اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جن کی ہم دوسروں سے توقع رکھتے ہیں۔ سب مذاہب کا آخری مقصد صرف بنی نوعِ انسان کی خدمت و بہبود ہے۔ اسی وجہ سے یہ نہایت ضروری ہے کہ مذہب کا استعمال ہمیشہ دوسروں کے لیے خوشی مہیّا کرنے کے واسطے نہ کہ تبلیغ کے واسطے کیا جانا چاہیے۔

مذہب کی کوئی قومی حدود نہیں ہیں بلکہ مذہب ہر انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا

بھی چاہیے۔ ضروری یہ ہے کہ ہر متلاشی کو وہ مذہب چُننا چاہیے جو اُس کے لیے کار آمد ہو۔ بہرحال ایک خاص مذہب کو قبول کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انسان دوسرے مذاہب یا اپنے سماج سے بالکل منحرف ہو جائے بلکہ یہ ضروری ہے جو کسی مذہبِ خصوصی کو قبول کرتے ہیں وہ اپنے سماج کے ساتھ منسلک رہیں۔ اپنے لوگوں کے درمیان بسر اوقات کریں اور ان سے مل جُل کر رہیں۔ اپنے ہی لوگوں سے دور بھاگ کر آپ کبھی دوسروں کا بھلا نہیں کرسکتے جبکہ رفاہِ عام ہی دراصل مذہب کا بنیادی مقصد ہے۔

دو باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ خود مشاہدہ اور خود آگاہی۔ ہمیں لگاتار دوسروں کے تئیں اپنے رویے کا جائزہ لینا چاہیے۔ اپنے آپ کو تولنا چاہیے اور جب خود کو غلطی پر پائیں تو غلطی کی درستی کرلینی چاہیے۔

آخرش کچھ الفاظ مادّی ترقی کے بارے میں کہوں گا۔ میں نے اہلِ غرب سے مادّی ترقی سے وابستہ بہت شکایات سُنی ہیں حالانکہ برعکس اِس کے یہی مادّی عروج غربی ممالک کا فخر بھی ہے۔ مقابلتاً مجھے مادّی ترقی میں کوئی خامی نظر نہیں آتی بشرطیکہ انسان کو اس میں ہمیشہ ترجیح ملے۔ یہ میرا یقینِ کامل ہے کہ ہر سطح پر انسانی مسائل کے حل کے واسطے ہمیں مادّی ترقی اور روحانیت میں صحیح تناسب اور وابستگی پیدا کرنی چاہیے۔

بہرحال ہمیں اس کی محدودیت معلوم ہونی چاہیے کیونکہ

بے شک سائنس اور تکنیکی کی شکل میں مادّی علمیات نے انسان کے لیے بیشتر سہولیات فراہم کی ہیں تو بھی یہ دائمی امن قائم کرنے میں قاصر ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ہی جو کہ تکنیکی طور پر دوسرے ممالک میں سب سے زیادہ ترقی پذیر مُلک ہے، اب بھی ذہنی کوفت کی افراط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادّی علم محض مادّی حالات پر مبنی خوشی ہی دے سکتا ہے۔ یہ اُس مسرّت کو مہیّا کرنے کے نا اہل ہے جو بیرونی عناصر سے مبرّا اندرونی ترقی پر منحصر ہے۔

انسانی قدروں کی بحالی اور دائمی مسرّت کے حصول کے لیے ہمیں دنیا کی تمام اقوام کی مشترکہ انسانی وراثت کی طرف دیکھنا ہوگا۔ میری دعا ہے کہ میرا یہ مضمون ایک اشد یاد دہانی کا کام کرے مبادا کہ ہم ان انسانی قدروں کو بھول جائیں جو ہم سب کو اِس دھرتی پر ایک انسانی کُنبے کے رشتوں میں جوڑتی ہیں۔

میں نے یہ سطور قلمبند کی ہیں
اپنے احساسِ مبہم کو زباں دینے کے واسطے
جب کبھی میں کسی غیر ملکی، شخص سے بھی ملتا ہوں
تو مجھے ہمیشہ یہی خیال آتا ہے
کہ میں انسانی کُنبے کے ایک اور فرد سے مل رہا ہوں
اس نظریے نے گہرائی بخشی ہے
ہر جان دار کے لیے میرے جذبۂ احترام و محبّت کو۔

کاش ! میری یہ قدرتی خواہش
امنِ عالم کے قیام میں میرا ادنیٰ سا حصّہ بن سکے
میں دعا کرتا ہوں اِس دھرتی پر
ایک زیادہ پُرخلوص و پُرمحبت
انسانی کنبے کے قیام کے واسطے
ان سب کے لیے
جو دُکھ کو ناپسند کرتے ہیں
جو دائمی مسرّت کے خواہاں ہیں
یہ میری دلی عرض ہے۔

تبت کے دلائی لامہ زمانۂ حال کے سب سے زیادہ قابلِ تعظیم رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں، مذہبی، علاقائی اور سیاسی حدود سے بالاتر اُٹھ کر انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں کو چھو لیتے ہیں۔ انھیں سچے معنوں میں ہر فرد و بشر کا غم ہے۔ وہ جو بھی کرتے ہیں اس کرۂ زمین پر حصولِ امن کی خاطر کرتے ہیں۔ "عالمی امن۔ ایک انسانی نظریہ" میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے بالکل پیچیدہ نہیں ہے۔ روزمرہ سے الگ بھی نہیں ہے۔ دراصل اپنی سادگی کی وجہ سے یہ بہت حد تک انقلابی بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سائنس اور تکنیکی اپنے کمالات کے باوجود اکیلے ہی خوشحالی اور امن نہیں لا سکتے۔ ایک ہی انسانی کنبے کے فرد ہونے کے ناطے اگر ہم عالمی ذمہ داری کا زاویۂ نظر پیدا نہیں کر سکتے، اور ایک دوسرے کو بھائی بہن نہیں تصور کر سکتے تو دنیا میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سے بھی بعید جناب دلائی لامہ عالمی سربراہوں سے اسی طور طریقے سے ملنے کی استدعا کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق ہمیں انسانی قدروں کے تئیں اپنے رویے میں انقلاب لانے کی اشد ضرورت ہے۔